جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مولانا حسین احمد مدنیؒ

کے بارہ میں

اپنے گستاخانہ رویہ پر

اشکِ ندامت

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی موقف سے اختلاف نہ پہلے گناہ تھا نہ اب ہے، بشرطیکہ یہ خلوص پر مبنی رہا ہو۔ مگر جہاں تک اپنے دور کے اس ولی کامل مجسمۂ اخلاص سراپا جہاد و عبدیت شیخ وقت کا تعلق ہے، ان کی شان میں توہین آمیز رویہ اور گستاخانہ جہالتوں کا ارتکاب، ایک ایسا گناہ ہے جو علیٰ رؤوس الاشہاد اور ببانگ دہل اظہارِ ندامت اور توبہ و اعترافِ قصور ہی سے شاید معاف ہو سکے، محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب صاحبِ دل اور صاحبِ قلم بزرگ ہیں، مسلم لیگ کے قافلہ سالاروں اور تحریکِ پاکستان کے اوّلین منادوں میں رہے مگر اللہ نے انکو خاص کرم سے نواز کر توفیق دی کہ وہ شیخ الاسلامؒ کی شان میں اپنے سابقہ گستاخانہ رویہ پر اشکِ ندامت بہائیں اور امت کے سامنے برملا اعترافِ تقصیر کر سکیں، یہاں ان کے مضمون کے کچھ حصے پیش ہیں۔ (سمیع الحق)

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گزشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۴ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس مجاہد اعظم شیخ الاسلام آیۃ من آیات اللہ الصمد سیدی و شیخی و سندی الحاج الحافظ المولوی سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کی شان رفیع البیان میں سرزد ہوئی ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر اور اقرارِ جرم کروں اور بارگاہِ ایزدی میں صدق دل سے استغفار کروں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کر دوں اور حقائق کو ان کی اصل شکل میں پیش کر دوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے

محض اخباری اطلاع کی بنا پر تین اشعار سپردِ قلم کئے تھے، جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ جناب طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول و منعطف کرائی کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساسِ ملت بنالو، اس لئے دیانت و عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۰ر مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہو گیا تھا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ر اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا جبکہ ان کا آخری مجموعہ کلام موسوم بہ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشیے میں اس حقیقتِ حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بنا پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولاناؒ نے اخباری رپورٹ کی تردید کر دی، اس لئے ان اشعار کو کالعدم یا مسترد سمجھنا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس لئے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیے میں حقیقتِ حال کو واضح کیا گیا۔

نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گزشتہ تیس سال سے مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بنا پر حضرتِ اقدسؒ سے بدگمان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی اصلاحِ خیال کا فریضہ بھی انجام دے دوں تاکہ وہ سوءِ ظن کے گناہ سے محفوظ ہو جائیں۔ میں ان اشعار کو تو خارج نہیں کر سکتا مگر مسلمانوں کو یہ تو بتا سکتا ہوں کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں نہ تو یہ فرمایا تھا کہ ملت کی بنیاد وطن ہے اور نہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم وطن کو اپنی ملت کی بنیاد بنالو۔ یہ اشعار بلا تحقیقِ حال سپردِ قلم ہو گئے تھے چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب پر حقیقت منکشف ہوئی تو انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے تھے بالفاظ دیگر ان اشعار کو قلمزد کر دیا تھا۔

اب میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور استقامت طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے اظہارِ حق کی توفیق عطا فرمائے اور میری توبہ کو قبول فرمائے اور اس تحریر کو عامۃ المسلمین کے لئے نافع بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

یہ بات مسلمانوں کی قومی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ میری یہ تنقید تلخ تو ہے مگر غلط نہیں ہے جن لوگوں نے سلاطینِ وقت سے اختلاف کیا تو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر یا قتل کر دیا یا محبوس

کر دیا اور جن افراد نے علماء سے اختلاف کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ (آگے اسکی چند مثالیں درج کرنے کے بعد) دوسری صدی ہجری سے لیکر عصر حاضر تک کسی زمانے میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا۔ یہ متعصبانہ روش اور یہ تنگ نظری صرف عقائد تک محدود رہتی تو بھی اک بات تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ بیماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہو گئی۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پر آشوب دور دیکھا ہے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ اُن تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلائلِ واضحہ اور براہین نیرّہ کی بنا پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدّار قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زر خرید کہا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ (جب ہوش رخصت ہو جاتا ہے اور صرف جوش کارفرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا چنانچہ ہر شخص ببانگ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لئے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت، نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت۔ اہلِ قرآن اور اہلِ حدیث، اہلِ فقہ اور اہلِ تصوف، بریلوی اور دیوبندی، سُنّی اور شیعہ، احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص تھا جس کے ہم خیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لئے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالمِ دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصوّر کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدّارِ قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلّط ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خاں جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سربلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہو گیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں ؎

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہد اعظم حضرۃ

مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی مقام خان مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا۔ خصوصاً ارکان جمعیۃ العلماء ہند، ان کی نیت نیک تھی، وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدارِ قوم یا ہندوؤں کے زر خرید نہیں تھے، چنانچہ عزت مآب صدر مملکت پاکستان بالقابہ[1] نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں: "سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائد اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی، لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا"[2]

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش بلکہ وہ ــــ علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔ کیونکہ ان کی بہت آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو سکے گی، کیونکہ لیگ کے ارباب حل و عقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن حامیانِ لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علماء دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں:-

۱۔ جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے، علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلافِ تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذاتِ خود خلافِ تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا۔ کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

---

[1] مراد ہیں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب، واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے کئی سال قبل کی ہے۔ [2] عزت مآب صاحب صدر بالقابہ کے اس خیال سے مجھے کلیۃً اتفاق نہیں ہے۔
(سلیم چشتی)

۲۔ جب حضرۃ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سید پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو حامیانِ لیگ کا ایک انبوہِ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہوگیا۔ ان لوگوں نے حضرتِ اقدسؒ کو گالیاں دیں اور جب حضرۃ موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرۃؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پہلے اسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ (حیات شیخ الاسلام ص۲۳۲ تا ص۲۳۴)

میں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دئے ہیں۔ تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اس زمانہ میں حامیان لیگ کی ذہنیت ایسی ہوگئی تھی کہ جو شخص ان سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اُسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی، ان لوگوں کو رواداری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا، مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر انہیں (جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان ہی رہنے دینا چاہئے۔"

سبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت سے، اپنے پیارے میم شین سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگرسی، جمعیتی اور احراری) زعمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ:

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کے ارکان تقسیم ہند کے حامی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی فراست مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے بہت مضر سمجھتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم لیگ کے پروپیگنڈا کے زیر اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور ان کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے" تو کون سا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا۔؟ یا ہو سکتا تھا۔؟ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ جب الجمعیۃ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ گلدستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے۔"

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے۔ ان کی عظمت، وقعت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی۔ حالانکہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو ہو جاتا ہوں۔

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفسِ امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا۔ اسی لئے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالت شان، للہیت، بزرگی اور بارگاہ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے۔ اس لئے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہارِ ندامت کرتا ہوں اور اس اعترافِ گناہ کو اس نیت سے شائع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمائے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔

(نامکمل)